R. N. 2186/57 Regd. No. A 822

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

Telephone No. 25
Telegrams: "ANJUMAN"

جلد ۲۱ - شمارہ ۲۴ | ایڈیٹر - آل احمد سرور | علی گڑھ - ۲۲ جون سنہ ۱۹۶۳ء

ل احمد

فن ترجمہ

یہ اگر صحیح ہے کہ علم اور کلچر مدام ترقی پذیر ہے بالخصوص اس زمانے میں جبکہ ذرائع رسل و رسائل کی سرعت و کثرت نے زمین کی طنابیں کھینچ دی ہیں؛ اور یہ اگر صحیح ہے کہ علم اور کلچر جغرافیائی حدود سے بے نیاز ہے؛ اور یہ اگر صحیح ہے کہ قومیں اتنا ہی علم سیکھ سکتی اور اتنی ہی کلچر یافتہ ہو سکتی ہیں جتنا کہ ان کی کتاب لغات کے اندر ہوتا ہے؛ تو ہر ذی فہم انسان تائید کرے گا کہ ہر زبان میں اور خاص کر کم مایہ زبانوں میں دوسری زبانوں سے بلند پایہ تصانیف کا منتقل ہوتے رہنا ازبس ضروری ہے۔ کیونکہ ازدیاد علم اور کلچر بروز کا اہم اور موثر ترین ذریعہ یہی ہے۔

ترجمے کر کے متمول بن جانے کی سب سے بڑی شہادت عربی زبان سے ملتی ہے: یہ ایک امر واقعہ ہے کہ عہد عباسیہ سے پہلے عربی زبان اتنی متمول و مکمل نہیں تھی جتنی وہ اس عہد میں ہوگئی۔ خلفائے بغداد کی علم دوستی اور فن پرستی کے نتیجے میں تقریباً سو سال تک حکمت یونان عربی زبان میں منتقل ہوئی اور بعض علوم سنسکرت زبان سے بھی حاصل کئے گئے۔ ایسا اگر نہ ہوتا تو ظاہر بات ہے کہ عربی زبان کی افضلیت و اکملیت اس درجے پر نہ ہوتی جہاں وہ آج پہنچی ہے؛ اور نہ ہی عربی زبان کی دنیا میں فلاطون ثانی (فارابی) پیدا ہو سکتا تھا۔

ترجمے کئے جانے کی اہمیت اور اس کا افادہ ثابت کرنے کے لئے کسی مزید استدلال کی ضرورت نہیں رہ جاتی ہے لیکن عہد حاضر کے بعض ادیبوں اور نقد نگاروں کی رائے معلوم ہو جانا بے جا نہ مفید ہوگا۔

میری نظر سے ایک انگریزی مضمون گزرا تھا جس میں صاحب مضمون نے بتایا تھا کہ یورپ کی تین بڑی زبانوں (جرمن، انگریزی اور فرانسیسی) میں علم و فن کی جو ترقی ہوتی ہے بمشکل اس کے پانچ سے لے کر دس فی صدی حصے کا ان زبانوں میں باہمی تبادلہ ہوتا ہے اور یہ صورت حال ترقی علم و فن کے نقطۂ نظر سے افسوسناک ہے۔

مشہور فرانسیسی ادیب و نقاد GIDE کا قول ہے کہ ہر اچھے ادیب کا قومی و ملکی فرض ہے کہ وہ کم از کم ایک اعلیٰ تصنیف کسی دوسری زبان سے اپنی زبان میں منتقل کرے۔

امریکی ناقد ادب ROLF HUMPHRIES کا ایک مضمون بعنوان TRANSLATION IN REVIVAL سنہ ۱۹۵۷ء میں شائع ہوا تھا۔ اس مضمون کے مطالعے سے معلوم ہوا کہ انگریزی زبان میں (دنیا کی وسیع و متمول ترین زبان ہونے کے باوجود) بیسویں صدی کے آغاز سے ترجمے کا احیاء ہوا ہے؛ اور نئے ترجموں کے علاوہ مستند ترجموں کا از سر نو ترجمہ کیا جا رہا ہے یا عصری زبان اور محاورے میں ان کی نئی تعبیریں کی جا رہی ہیں۔ حد یہ ہے کہ بائبل کے انگریزی ترجمے کی زبان معیاری سمجھی جاتی تھی مگر اسے بھی آج کے محاورے میں لکھا گیا ہے۔

ہمفریز نے اس مضمون میں ایک ہی بات پر زیادہ زور دیا ہے کہ ترجمہ ہمیشہ بامحاورہ و سلیس ہونا چاہئے۔ اس لئے وہ لسانی اعتبار سے مترجم کو اس حد تک آزاد کر دیتا ہے جہاں تک کہ اصل مصنف کا خیال و احساس بے کم و کاست ادا ہو جائے۔ مثلاً اس نے کہا ہے کہ: ACCORDING TO HIS CUSTOM (OR WONT) کے مقابلے میں THE WAY HE ALWAYS DID سلیس و فصیح ہے۔ اس نے بعض انگریزی مترجمین کی فروگذاشتوں پر تبصرہ کیا ہے۔ مشہور فرانسیسی شاعر MELARME کے مترجم ROGER FLY کی مندرجہ ذیل لائن کے ترجمے کو ناقص کہا ہے:-

THE FLESH IS SAD, ALAS! AND ALL BOOKS I HAVE READ.

اور اس ترجمے کے آخری حصے کو دوسری طرح لکھ کر اصلاح کی ہے:-

THE FLESH IS SAD, ALAS! AND I HAVE READ ALL THE BOOKS.

اس خفیف سی اصلاح نے مفہوم کو بدل دیا اور اس کے فرق کو اہل نظر بآسانی دیکھ سکیں گے۔

اس کے مقابلے میں جب دیکھا جاتا ہے کہ اُردو زبان میں ترجمے کا کیا درجہ و مرتبہ ہے تو سخت مایوسی ہوتی ہے۔ تمدن عرب، تمدن ہند جیسی بلند پایہ تصانیف کا اُردو میں منتقل ہو جانا نہایت مبارک اقدام اور ایک کارنامہ عظیم تھا۔ مگر ساتھ ہی اُردو میں ان کتابوں کا وجود حقیقتاً ایک ہدایت و تنبیہ بھی تھا کہ یہ کام اس معیار پر جاری رہنا چاہئے۔ لیکن واحسرتا! بلگرامی جیسے فضلاء کے بعد کی نسلوں نے ترجمے سے بے اعتنائی برت کر فی المعنی یہ ثابت کیا کہ بلگرامی نے اپنا بیش قیمت اور اس لئے نہایت عزیز وقت ضائع کرنے کی حماقت کی! فاعتبروا یا اولی الابصار!

یہ حقیقت کم درجہ حیرت انگیز نہیں کہ اُردو کے ایسے لکھنے والے بھی جو چار سطر کی عبارت صحیح لکھنے پر قادر نہ ہوں وہ ترجمہ کرنے کو ادبیانہ شان کے منافی سمجھیں! ہر چند کہ اُردو زبان کی خیریت اسی میں ہے کہ ایسے ادیب ترجمہ کرنے کی زحمت گوارا ہی نہ کریں۔

تمدن عرب، تمدن ہند جیسی اہم تصانیف کے علاوہ اُردو میں چند ہی ایسے ترجمے ہوئے جن کی کوئی علمی و ادبی قدر رہی تھی۔ افسانوی ادب کے کچھ ترجمے ہوئے بھی تو وہ ادبی صناعت سے معرا تھے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے کہ ان ترجموں میں فن ترجمہ کے مستلزمات کا اتباع نہیں کیا گیا تھا؛ کیونکہ مترجم خود اصول ترجمہ سے واقف نہیں تھے، بلکہ یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ ترجمہ کرنا بجائے خود ایک فن ہے اور اس کے کچھ اصول قائم ہو چکے ہیں۔ ایک اور بڑی کمی ان مترجمین میں یہ تھی کہ انھیں خود اپنی زبان میں پورا درک حاصل نہ تھا۔

اس صورت حال کی غلطی اور اس ذہنی انداز کا جہل، اظہر من الشمس ہے؛ اور اس کی ممکن توجیہ ایک ہی ہے کہ اُردو کی دنیا سے علمیت مفقود ہو چکی ہے۔ اس فقدان علمیت پر راقم سطور نے ایک جداگانہ مضمون بعنوان "حالیہ اُردو دانشوری و عوامیت" میں اظہار خیال کیا ہے۔

ہمارے بعض دانشوروں نے ترجمے کے باب میں ایک اور بھی دقیانوسی خیال قائم کر رکھا ہے: ایسے لوگ لفظی ترجمے کو ہی FAITHFUL ترجمہ سمجھتے ہیں اور ان کے نزدیک ترجمے کا کمال یہ ہے کہ اسم کا ترجمہ اسم سے اور فعل کا فعل سے ہو، وقس علی ہٰذا۔ یہ خیال شاید اس وقت قائم ہوا تھا جب ہم نے انگریزی پڑھنے کی ابتدا کی تھی۔ اس عندیے کو "مکتبی ذہنیت" کی پیداوار کہا جا سکتا ہے کیونکہ ان بزرگوں کے سامنے صناعت ادب اور انتقاد ادب کے وہ اصول نہیں تھے جو آج معلوم عام ہیں۔

آج ہر گونہ ایصال (COMMUNICATION) انتقاد ادب کا اہم ترین اصول ہے۔ اتنا اہم اصول کہ انتقاد ادب کے باقی تمام اصول کی تعمیل کر دی جائے اور صرف اس اصول کی۔ کی جا سکے تو ایسی

تالیف یا تصنیف صناعت ادب کا درجہ حاصل نہیں کر سکے گی اور ایصال کا مفہوم یہ ہے کہ شاعر یا ادیب کا مقصود ذہنی بجنسہٖ و بتمامہٖ قاری کو منتقل ہو جائے تاکہ وہ شاعر یا ادیب کے خیال و احساس میں مساویانہ شریک ہو سکے۔

اس اصطلاح "ایصال" کا مفہوم ہمارے متقدمین "تاثیر کلام" کہہ کر ادا کرتے تھے۔ اور یہ بات بادنیٰ تامل سمجھ میں آ جاتی ہے کہ جب تک اظہار خیال و احساس کا وسیلہ یعنی زبان سلیس اور بیان دلنشین نہ ہوگا ایصال کا مقصد حاصل نہ ہو سکے گا؛ ترجمہ ہو یا طبعزاد، اس کی عبارت اگر ناہموار و ناشستہ ہوگی تو دلنشین نہیں ہو سکتی ہے۔ اور لفظی ترجمے کی عبارت کا بھونڈا ہونا ناگزیر ہے۔ ہمارے سامنے یہ حقیقت ہونا چاہئے کہ ابتداءً کلام مجید کے لفظی ترجمے ہونے کے باعث دلنشین نہیں تھے بلکہ مفہوم کا سمجھنا دشوار ہوتا تھا، اس لئے بامحاورہ ترجموں کی ضرورت محسوس کی گئی۔ اس دلیل کی بناء پر بھی لفظی ترجمے کی غلطی ظاہر ہے۔

میری دانست میں لفظی ترجمے کا عندیہ انگریزی لفظ FAITHFUL کی غلط تعبیر سے پیدا ہوا۔ ترجمہ بلاشک FAITHFUL ہی ہونا چاہئے؛ لیکن جداگانہ الفاظ کا نہیں بلکہ مصنف کا ترجمہ کیا جانا چاہئے۔ اور مصنف کا ترجمہ کئے جانے سے مراد یہ ہے کہ اس کا خیال و احساس یا مقصود ذہنی بلا کم و کاست پیش کیا جا سکے۔

ہماری زبان میں ایک اصطلاح "آزاد ترجمے" کی بھی مستعمل ہے میرے خیال میں اس اصطلاح کا وضع ہونا لفظی ترجمے کے خیال کا ردعمل ہے؛ ورنہ اس اصطلاح کے وجود میں آنے کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ متفق علیہ نظریہ ہے کہ ایک زبان کی خوبی یعنی حسن بیان دوسری زبان میں منتقل ہو سکنا ناممکن ہے؛ کیونکہ ہر زبان کا اپنا مزاج ہوتا ہے اور اظہار بیان کے سانچے مختلف ہوتے ہیں۔ اس لئے لسانی اعتبار سے ترجمے کا آزاد ہونا ناگزیر ہے۔ البتہ مترجم خود اگر صناع ادب ہے تو وہ اپنی زبان کے استعارہ و تشبیہ اور محاورہ و روزمرہ کے استعمال سے حسن زبان و بیان پیدا کر دیتا اور عبارت کو دلنشین بنا دیتا ہے۔ اور ایسا کرنا اس کے لئے لازمی بھی ہے۔ دوسری صورت میں ظاہر ہے کہ وہ ترجمہ تخلیقی ادب کا درجہ نہیں پا سکے گا۔ اس بناء پر مترجم کے لئے ضروری ہے کہ اسے اپنی زبان کے محاورے پر پوری دسترس حاصل ہو۔

(باقی صفحہ ۸ پر)

ہماری زبان

۲۲ر جون سنہ ۱۹۶۲ء

آسان زبان اور ریڈیو

حال میں شری گوپالا ریڈی وزیر نشریات نے لوک سبھا میں تقریر کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا کہ ریڈیو کی زبان آسان ہونی چاہیے تاکہ اُسے زیادہ سے زیادہ لوگ سمجھ سکیں۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے ایک پریس کانفرنس میں بتایا کہ وہ ریڈیو کی زبان سے مطمئن نہیں اور چاہتے ہیں کہ اُسے عام فہم بنایا جائے۔

شکر ہے کہ دس برس کے بعد اب یہ احساس ہو چلا ہے کہ مشکل اور مصنوعی زبان استعمال کرنا ملک کے حق میں کانٹے بونا ہے۔ زبان کا مقصد یہ ہے کہ ایک کے خیالات و جذبات کو دوسرے تک منتقل کیا جا سکے۔ اس بنیادی عمل کو نظر انداز کرنا اور جان بوجھ کر مشکل اور ثقیل زبان استعمال کرنا اوّل تو خواص پسندی ہے، دوسرے ایک قومی ادارے سے غلط کام لینا ہے۔

ریڈیو ایک قومی ادارہ ہے۔ اس کا مقصد ہندوستانی قوم کو حالاتِ حاضرہ سے باخبر رکھنا، کارآمد اور مفید معلومات بہم پہنچانا اور اس کی ذہنی تفریح کے لئے مناسب غذا مہیا کرنا ہے۔ ریڈیو کا مقصد ملک کے ہر گوشے کی تہذیبی خصوصیات کو اس طرح پیش کرنا ہے کہ ان اجزا سے ایک مجموعی تصور سامنے آجائے۔ ریڈیو قومی وحدت کے لئے سب سے بڑا آلہ ہو سکتا ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ قومی وحدت کا آلہ بننے کے لئے حقائق کا عرفان، ہر چیز کی قدر و قیمت کا احساس اور کسی محدود لسانی مقصد کی تبلیغ کے بجائے عام قومی مفاد کا لحاظ ضروری ہے۔ افسوس ہے کہ اب تک یہی چیز اہم نہیں سمجھی گئی۔

زبان ادیبوں اور عالموں کی جاگیر نہیں ہے۔ زبان عوام بناتے ہیں۔ ادیب اور عالم اسے آراستہ کرتے ہیں مگر پالش کا زیادہ شوق مضر ہو سکتا ہے جس طرح بہت سا زیور بدنما لگ سکتا ہے۔ اس وقت انگریزی کے سلسلے میں مشکل اور آسان زبان کا مسئلہ پیدا نہیں ہوتا۔ صدیوں سے انگریزی ادب معیاری انگریزی زبان سے قریب ہے اور خواندگی کے بعد سبھی اس سے لطف اُٹھا سکتے ہیں۔ ہندوستانی زبانوں میں عام طور پر ادب کی زبان، عام بول چال کی زبان سے خاصی دور ہے۔ ہر زبان میں اس خلیج کو پاٹنے کی قابلِ قدر کوششیں ہوئی ہیں۔ مگر خلیج ابھی پُر نہیں ہوئی۔ انگریزی کی جگہ ہندی کو استعمال کرنے والوں کا پہلا فرض یہ تھا کہ وہ اس کے عام فہم ہونے پر سب سے زیادہ زور دیں، مگر ہندی کے نادان دوستوں نے اپنے جوش میں یہ سمجھا کہ اس میں اُردو کے الفاظ کا جو سرمایہ ہے اور اُردو کے اسالیب کا جو ذخیرہ ہے اُسے دور کئے بغیر وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوں گے۔ یہ بہت بڑی غلطی تھی۔ اُردو کے بہت سے الفاظ اور فارسی عربی کے بہت سے الفاظ آزادی کی تحریک کے ذریعہ سے ہندوستان کی سب زبانوں میں داخل ہو گئے ہیں۔ ہندوستان کے عوام بڑی حد تک آسان اُردو یا آسان ہندی یا ہندوستانی سمجھ سکتے ہیں۔ بنگال میں بھی اور [illegible] میں بھی۔ اس سرمائے کو نکالنے کی کوشش، نہ صرف لسانیات کی رو سے نامناسب تھی بلکہ تہذیبی اور قومی نقطۂ نظر سے بھی غلط تھی۔ مگر یہ کوشش جاری رہی اور اس کے نتائج سے ہمارے سرکاری حلقے اب تک بے پروا رہے۔ سرکاری مقاصد، انتظامی امور، عام ضروریات کے لئے اصطلاحات کی ضرورت مسلّم سہی مگر اصطلاحات کے لئے صرف سنسکرت سے مدد لینا اور فارسی کی رائج اصطلاحات یا انگریزی کی عام فہم اصطلاحات کو نظر انداز کرنا، بہت بڑی بھول تھی۔ ظاہر ہے کہ ریڈیو پر جو تقریریں ہوں گی اُن کی زبان خاصی ادبی ہو گی، مگر چونکہ تقریریں صرف ادبی نہیں ہوتیں معلوماتی بھی ہوتی ہیں، اس لئے یہاں بھی ابلاغ یا ترسیل کے مسئلے کو بڑی اہمیت حاصل ہو جاتی ہے۔ خبروں میں، فیچروں میں، آنکھوں دیکھے حال میں، ڈراما میں، اگر زبان عام فہم نہیں تو وہ سورج کی اس روشنی کی طرح ہوتی ہے جو گرد و غبار کی وجہ سے ہم تک نہیں پہنچ پاتی۔ ریڈیو کی آواز الفاظ کے ذریعہ سے کانوں تک پہنچتی ہے۔ الفاظ جو بولے جاتے ہیں، اُن الفاظ سے جو لکھے جاتے ہیں، مختلف آہنگ رکھتے ہیں۔ یہاں بول چال کی زبان کی حکومت ہونی چاہئے۔ کتاب میں لکھی جانے والی اور معیاری زبان کی نہیں۔ ہندی کو راشٹر بھاشا بنانے کی منزل میں بول چال کی زبان کو سامنے رکھنا زیادہ ضروری تھا۔ ادبی زبان کو نہیں۔

اسی لئے شری گوپالا ریڈی کا یہ خیال کہ خبروں کی زبان سنسکرت آمیز ہندی ہو نہ اُردوئے معلّی، اچھا خیال ہے۔ اس کے لئے گاندھی جی کے خیالات اور پنڈت نہرو کا عمل ہمارے سامنے ہیں۔ پنڈت جی کی تقریر سُنیے تو ہر بات سمجھ میں آتی ہے اور اس کا اثر ہوتا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ لوگوں کے ذہن کو کس طرح اپنی طرف مائل کیا جائے اور اپنی بات کس طرح اُن کے دل میں اُتاری جائے۔ اگر اُن کی تقریریں فیتے پر ریکارڈ کر کے سُنی جائیں تو ان کا اثر وہی رہے گا۔ اگر فیتے کے ریکارڈ کو ویسے ہی قلم بند کر کے چھاپا جائے تو اُکھڑی اُکھڑی معلوم ہو گی گو پنڈت جی ادیب ہیں۔ تقریر کی زبان کا یہ رنگ عجز کا مظہر نہیں عرفان کا مظہر ہے۔ اور یہ تو مسلّم ہے کہ پنڈت جی کی زبان سب سمجھتے ہیں۔ عارف بھی اور عامی بھی، خواص بھی اور عوام بھی۔

یہ ہماری زندگی کا تجربہ ہے کہ پنڈت جی کی تقریروں کی زبان میں، اور اس زبان میں جس میں ریڈیو سے ان تقریروں کا تعارف ہوتا ہے، نمایاں فرق ہوتا ہے۔ کم سے کم یہ فرق تو ختم ہونا چاہئے اور خبروں کی زبان خواہ وہ ہندی میں ہوں یا اردو میں، بڑی حد تک ایک ہونی چاہئے۔ اس سے نہ صرف ریڈیو کی افادیت بڑھے گی بلکہ قومی وحدت کے مقصد کو بھی بہت بڑی تقویت پہنچے گی۔

انجمن ترقی اردو بمبئی

۲۶ مئی کو انجمن ترقی اردو بمبئی نے ادب کے ذریعے قومی یکجہتی کی تحریک کا ایک نئے ڈھنگ سے آغاز کیا۔ چنانچہ اس سلسلے میں ۲۶ اور ۲۸ مئی کو مشاعرہ، سمپوزیم، موسیقی اور ڈرامے کے پروگرام کامیابی کے ساتھ پیش کئے گئے۔

۲۶ مئی کا پروگرام مشاعرے اور سمپوزیم کے لئے مخصوص تھا ریاست مہاراشٹر کے وزیر صالح بھائی عبدالقادر نے اس کا افتتاح کیا۔ اس مشاعرے کا ایک قابل ذکر پہلو یہ تھا کہ اردو اور ہندی کے علاوہ، مراٹھی، گجراتی، تامل اور تلگو کے شعرا نے بھی اس مشاعرے میں کامیابی کے ساتھ حصہ لیا۔ سمینار میں جن لوگوں نے حصہ لیا ان میں سندر لال ترپاٹھی اور سردار جعفری کے نام قابل ذکر ہیں۔

۲۸ مئی کو موسیقی کے علاوہ منشی پریم چند کی مشہور کہانی "کفن"، اور کرشن چندر کا لکھا ہوا ڈرامہ "دروازے کھول دو" بھی پیش کیا گیا جو مخصوص اسی موقع کے لئے لکھا گیا تھا۔

انجمن ترقی اردو شیخوپورہ

۲۴ مئی کو انجمن ترقی اردو کے زیر اہتمام ایک جلسہ ڈی ایم ہائر سکنڈری اسکول کی عمارت میں منعقد ہوا۔

جلسے کی ابتدائی کارروائی کے بعد حبیب الرحمٰن صاحب سکریٹری انجمن ترقی اردو شیخوپورہ نے انجمن کی کارگذاری کی ایک مختصر رپورٹ پیش کرتے ہوئے بتلایا کہ اب سے ایک سال پہلے شیخوپورہ کے ادب دوست حضرات نے بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کی ایک شاخ قائم کی تھی، اور اس کے تحت ممبر سازی کا کام شروع کیا تھا جو اب تک جاری ہے۔ انجمن کے کافی ممبر بن چکے ہیں اور اس کا الحاق بھی بہار کی ریاستی انجمن ترقی اردو سے ہو چکا ہے۔

شاداب ٹرسٹ حیدرآباد

۲۲ مئی کو چند اصحاب نے ایک "شاداب ٹرسٹ فنڈ کمیٹی" قائم کی جس کے اراکین میں حبیب الرحمٰن صاحب معتمد انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش، عابد علی خاں صاحب، یدھ ویر صاحب اڈیٹر ملاپ، راجہ جیا لال جی کھنڈوا، سوشلسٹ رہنما بدری وشال پتی، مخدوم محی الدین، پنڈت گردھر پرشاد صاحب ایڈوکیٹ، ریوا بندر ریحانی، منوہر راج سکسینہ ایڈوکیٹ، معین الدین صاحب ذکی، بالا پرشاد صاحب فاضل، حبیب الرحمٰن صاحب، محبوب نارائن صاحب گوڑ، سری واس لاہوتی، کاشی رام صاحب میونسپل کمشنر اور دیگر احباب شامل ہیں۔ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ اس کے معتمد ہیں۔

کمیٹی نے دس ہزار کی رقم جمع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس رقم سے ایک مکان بیگم شاداب کے نام خرید دیا جائے گا جس کا نام "شاداب کدہ" ہوگا اور اس کی آمدنی سے شاداب کے بچوں کی تعلیم کا انتظام ہو سکے گا۔ بیگم شاداب کو ماہانہ کچھ روپے دیئے جائیں گے۔

اردو آرٹس کالج

حیدرآباد کے اردو دوست حضرات ایک ایسے اردو کالج کے قیام کی کوشش کر رہے ہیں جہاں غیر سائنسی مضامین اردو میں پڑھائے جائیں گے اس کے گورننگ باڈی کے صدر مولوی احمد علی خاں صاحب وزیر تعمیرات آندھرا پردیش ہیں معتمد مولوی حبیب الرحمٰن صاحب اور شریک معتمد عابد علی خاں صاحب اڈیٹر سیاست ہیں۔ اراکین میں جانکی پرشاد صاحب، حسین شاہد صاحب، یونس صاحب اور راج بہادر گوڑ وغیرہ شامل ہیں۔

اردو ہال ٹرسٹ نے اس کالج کے لئے دس ہزار اور انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش نے ۵ ہزار کی رقم دی ہے مزید دس ہزار بہت جلد جمع ہو جانے کی توقع ہے۔

اردو لکھنے والوں کی ایک انجمن امداد باہمی بھی تشکیل دی جا رہی ہے جو اراکین کی ادبی تخلیقات کی اشاعت کرے گی۔ اس کا اپنا چھاپہ خانہ ہوگا۔ کتابوں کی وہ کاتب ہوں گی۔ وہ دوسری زبانوں کے ادب کے ترجموں کا بھی اہتمام کرے گی۔ سوسائٹی کا حصہ (۱۰۰) روپیہ ہوگا اور سرمایہ دو لاکھ۔ سرکار سے بھی مالی امداد حاصل کی جائے گی۔

انجمن تعمیر اردو - دلی

انجمن تعمیر اردو دلی کی ہفتہ وار ادبی نشست اتوار ۱۰ جون کو روایات کے مطابق بہ حسن و خوبی منعقد ہوئی۔ جناب فقیر محمد بیگ صاحب نے صدارت فرمائی اور انجمن کے کاموں کی تعریف کی۔

منظومی پروگرام میں جناب نظمی سکندرآبادی صاحب نے ایک غزل پیش کی۔ اور رشید احمد غازی صاحب نے ایک مقالہ "غالب کے اشعار، گنجینۂ معانی" پیش کیا۔ فاضل مقالہ نگار نے غالب کے بعض الجھے ہوئے اشعار پر شارحین کے مطالب سے اختلاف کرتے ہوئے اپنا نظریہ پیش کیا۔

ضروری گزارش

براہ مہربانی انجمن سے متعلق جملہ خط کتابت اور ارسال زر
"جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ" کے پتے پر فرمایئے

جن خطوں پر منصب کی بجائے نام لکھا ہوتا ہے ایسے خطوں کی تعمیل میں مختلف وجوہ سے دیر ہو جاتی ہے۔ جس کے نام خط لکھا گیا ہے اگر وہ کارکن چھٹی پر ہو، بیمار ہو، دورے میں ہو یا عدم موجودگی کی کوئی اور صورت ہو تو وہ ڈاک کھلتی نہیں اور اہم خطوط کا جواب بروقت نہیں دیا جا سکتا
اس لئے سب سے بہتر صورت یہ ہے کہ آپ ہمیشہ اپنے خط

جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ کے پتے پر بھیجئے۔ شکریہ

حصہ نظم

دانش فرازی

ابن مریم

ایک دو دن کا نہیں ذکر کہ صدیاں گزریں
ابن مریم کا بدن اب بھی ہے پیوستِ صلیب
اب بھی تھاما ہوا خاموش ہے دامانِ شکیب
اس کی آنکھوں میں ہے تاریخ کے اوراق کا راز
اس کے پھیلے ہوئے بازو میں زمانوں کا طلسم
وہ اگر مہر بہ لب ہے تو خموشی اس کی
باوجودِ غمِ واماندہ وفا بولتی ہے
یعنی اسرارِ دو عالم کی گرہ کھولتی ہے

(۲)

شب کے سناٹے میں دو کالے سائے باہم
دل میں اک زخمِ گراں باریٔ حالات لئے
اپنی تقدیر کے حصے میں سیہ رات لئے
نرم قدموں کی سُبک چاپ سے خود ہی ڈرتے
غمِ بے مہریٔ ایام سے آہیں بھرتے
چارہ سازِ غمِ دوراں کے قریب آئے ہیں
گنجِ فطرت کے نگہباں کے قریب آئے ہیں

(۳)

چاند مندر کے کلس سے آگے
نور افشاں ابر کی کشتی میں سوار
مضمحل، سر بہ گریباں و تجلی بکنار
سوچتا ہے یہ غمِ زیست کے مارے ہوئے لوگ
اپنے ہی درد کی زنجیر میں وابستہ ہیں
اور یہ عیسیٰ مریم، یہ نقیبِ ہستی
سالہا سال سے ہر وقت ہے پیوستِ صلیب
اب بھی رستا ہے ہر اک زخم سے گلرنگ لہو
اس کا غم اس کی خلش اس کی تڑپ کا عالم
کس نے دیکھا ہے؟
کسی نے بھی نہیں دیکھا ہے!
اس کو زندانِ کشاکش سے یہاں جذبۂ خلوص
آج تک کس نے رہائی بخشی
"کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق"
ابن مریم کے سوا
رہبرِ اعظم کے سوا

شاہین غازی پوری

ایک دوست کی رخصت پر

بہار آتے ہی پہلی کلی جو کھلتی ہے
تو دل کو حد سے زیادہ سرور ہوتا ہے
وہی کلی ہو مگر جب نگاہ سے اوجھل
تو آبگینۂ دل چور چور ہوتا ہے

ٹھہر ٹھہر دلِ بے تاب! اس قدر نہ دھڑک
کسی کا راستہ کب کوئی روک پایا ہے
یہاں تو سب کو ہے دھن اپنی اپنی منزل کی
ہر ایک شخص کا ساتھی بس اس کا سایا ہے

عزیز دوست شفیق اور مہرباں استاد
تو اس جہاں میں جہاں بھی رہے رہے آباد
اداس ہم ہیں مگر تیری کامرانی پہ
خلوصِ دل سے تجھے دیتے ہیں مبارک باد

جلائے ہیں جو ہمارے دلوں میں تو نے چراغ
ہمیں نہ خوف رہے گا کبھی اندھیروں کا
یہ وہ چراغ ہیں بجھتے نہیں جو آندھی میں
یہی دکھائیں گے رستہ ہمیں سویروں کا

غزل

اسرار حسین علی اختر

کبھی سکون کبھی [illegible] کے مارے گئے ہیں
محبت [illegible] وہ پاس [illegible] ہیں
دلوں سے خون سے تعمیر ہے سراپا [illegible]
خیال [illegible] ستم [illegible] ہیں
ترے خیال نے وارفتہ کر دیا ایسا
ہر اک خیال سے بیگانہ وار گزرے ہیں
ہمارے خون کی رنگینیاں کوئی دیکھے
روش روش پہ لٹاتے بہار گزرے ہیں
یہ کہہ رہی ہے گلوں کی شگفتگی اختر
ادھر سے تبسم کے کچھ [illegible] گزرے ہیں

صلاح الدین نیر

یہ تو کیا گردشِ دوراں کے قدم رک جائے
[illegible] سلیقہ سے بچارا بھی نہیں
میرے غموں کا سبب [illegible] ایک [illegible] تھا
ہم نے [illegible] ہوئی [illegible] تجھ بھی نہیں
اپنے احساس کی دنیا میں اکیلا ہوں مگر
تیری یادوں کی قسم اتنا اکیلا بھی نہیں

ساغر شیلی

ہیں وہ مرد وہ جو عشق جنوں جسے زندگی کی تلاش ہے
جسے زندگی سے گریز ہے جسے دوستی کی تلاش ہے
مری محبت کو نہ دیکھیے مری [illegible] جاتا ہے
جو خودی کی حد سے ہے دور [illegible] کسی کی تلاش ہے
وہی شغل بادہ و جام ہے وہی مے کشی کا مقام ہے
کبھی بے خودی کی تلاش تھی [illegible] خودی کی تلاش ہے

ڈاکٹر افسر پلاڈی

اُردُو املا ؛ اور چند تجاویز

اُردو املا پر غور کرتے وقت تین بنیادی سوال پیدا ہوتے ہیں!

۱۔ اردو املا میں حروفِ تہجی کس کس زبان سے لئے گئے ہیں؟ پہلے ان کی ابتدائی شکلیں کیا تھیں؟ اور اب کیا ہیں؟

۲۔ اُردو املا میں کتنے حروف لکھے جاتے ہیں، اور منہ سے ادا نہیں کئے جاتے ہیں۔ اور ان کے لئے موجودہ وقت میں کیا صورت اختیار کرنی چاہیئے؟

۳۔ علامات اور اعراب کا مخرج کس طرح ہونا چاہیئے؟ اور کہاں کہاں؟

اُردو کی تقطیع' عربی، فارسی اور ہندی حروف پر مشتمل ہے اس میں' ابجد، ہوز، حطی، کلمن، سعفص، قرشت، ثخذ، ضظغ۔ اٹھائیس حروف عربی النسل ہیں، جو ہندستان میں عربوں کے ساتھ آئے۔ ہمزہ (ء یا ء) بھی عربی ہے، لیکن حروفِ تہجی میں نہیں ہے' لکھا اور بولا بھی جاتا ہے۔ پ، چ، ژ، گ چار حروف فارسی النسل ہیں۔ اور اہلِ فارس کی اردو کو دین ہیں (ان میں گاف تھوڑا مشکوک ہے! یعنی سنسکرت داں کے قول کے مطابق یہ اُن کی زبان (سنسکرت) کا حرف ہے، کسی اور زبان کا نہیں، مگر اہلِ فارس گاف کو صرف اپنا ہی گردانتے ہیں۔ مثلاً: "سوگند" یہ لفظ فارسی لغات میں فارسی ہے؛ اور سنسکرت لغات میں سنسکرت۔ چونکہ اس میں حرف گ کا مخرج ہے۔ خیر! یہ ایک الگ بحث ہے)

جب گاف اُردو تقطیع میں لیا گیا تو اس کی سب سے پہلی شکل ک کے اوپر ایک سانپ نما زنجیر (ﮔ) کی سی تھی، اس طرح ماہرینِ اُردو املا نے کاف اور گاف میں تمیز کرنے کے لئے ایک راہ کھول دی! اب اس سانپ نما زنجیر کی جگہ پر ک کے سر ہی کا ٹکڑا ک کے اوپر لگایا جانے لگا ہے جس کی موجودہ شکل اس طرح گاگ ہے۔

ماہرینِ اُردو املا نے ان حروفِ تہجی میں ہندی سے (ट) ٹ، (ड) ڈ، (ड़) ڑ کا اضافہ کیا، اور ट کی شکل قائم کی۔ اُردو میں ب، ت، پ، ث، حروف پہلے ہی سے موجود تھے، اور ट ان میں صوتی اعتبار سے کچھ مماثل تھا، اس لئے اس کی شکل ب، ت، پ، ث کی ہمراہی میں دی گئی، لیکن ب کے نیچے پہلے سے ایک نقطہ موجود تھا، پ کے نیچے تین، ت کے اوپر دو، اور ث کے اوپر تین تھے، اس وجہ سے ट کی شکل سب سے پہلے چار نقطے لگا کر قائم کی گئی، یعنی ट کی سب سے پہلی شکل یہ ٿ تھی۔ (اس شکل کو اُردو کی پرانی کتابوں میں دیکھا جا سکتا ہے) بعد کو اس کے اوپر اور نیچے کے نقطے حذف کر دئے گئے۔ اور اس کی شکل اس طرح تـ کی ہو گئی، یہ بھی کتابت پر بار ہوئی تو ماہرینِ اُردو املا نے اس کے اوپر ایک چھوٹی سی ط کا استعمال شروع کیا! جو آج تک اس طرح ٹ میں رائج ہے۔

ड اور ड़ (ڈ اور ڑ) کا بھی ماہرینِ اُردو املا کے سامنے یہی مسئلہ تھا۔ چونکہ د، ذ، ر، ز، ژ پہلے سے موجود تھے اور ड ड़ صوتی اعتبار سے ان سے قریب تھے۔ مجبوراً پرانی (ٿ) کی طرح ڈ اور ڑ پر بھی چار نقطے قائم کئے اور ان حروف (ड़، ड) کو بھی د، ر کی شکل سا بنا لیا گیا، اسی طرح ڈ، اور ڑ کی شکلیں قائم ہوئیں۔ (یہ شکلیں بھی اُردو کی قدیم کتابوں میں دیکھی جا سکتی ہیں)، آج ان کی ترقی یافتہ شکل ڈ اور ڑ ہے،

بعد میں ہندی سے (भ) بھ، (फ) پھ، (ढ़) ڑھ، (छ) چھ، (ढ) ڈھ، (ड़) ڑھ، (ख) کھ، (घ) گھ، کی بھی اُردو شکلیں قائم کی گئیں۔ भ اردو حرف ب سے، फ پ سے، ठ ٹ سے، छ چ سے، ढ ڈ سے، ड़ ڑ سے، ख ک سے اور घ گ سے صوتی اعتبار پر کچھ مماثل تھے۔ لیکن یہ تمام حروف اس میل کے باوجود صوتی تھے اس لئے ان میں دو چشمی ھ کا اضافہ کر کے ان کو اردو حروف ب، پ، ج، چ، د، ر، ک، گ کا پڑوسی متعین کر لیا گیا اور یوں ان کا انشائی اور صوتی فرق عمل میں آگیا۔

اس طرح اُردو کی تقطیع ایک بحرِ بیکراں کی حیثیت میں آگئی اور آج دنیا کی ہر ایک زبان کا ہر ایک حرف اردو حروفِ تہجی میں مل جاتا ہے۔ یہ فضیلت کچھ کم نہیں ہے، اگر ان حروف میں سے کوئی حرف کم کر دیا جائے جیسا کہ آئے دن اس قسم کی تحریکیں اُٹھتی ہیں تو صرف ایک حرف کے کم کر دینے سے ہی اُردو کا ایک بڑی حد تک لسانی سرمایہ فوت ہو جائے گا۔ پھر ان میں سے دو تین یا چار پانچ حروف کم کر دینے کا فیصلہ تو اور بھی زیادہ افسوسناک اور ناقابلِ برداشت ہوگا، اور آنے والی نسلیں اپنے علم و ادب سے بڑی حد تک بے بہرہ ہو جائیں گی۔

دوسرا مسئلہ ان اردو حروف کا ہے، جو لکھے تو جاتے ہیں لیکن منہ سے ادا نہیں ہوتے۔ وہ یہ ہیں:۔

پہلے عربی (ال) کو لیجیے! یہ جن لفظوں کے درمیان آتا ہے، وہاں کبھی الف ساکن ہوتا ہے! جیسے شمس العلماء میں الف، اور کہیں الف اور لام دونوں ساکت ہو جاتے ہیں مثلاً شمس الدین۔

دوم بعض عربی الفاظ میں حروفِ علت (ا، و، یے) ذیل میں بیان کی ہوئی صورت اختیار کر کے بالکل نہیں بولے جاتے، مثلاً بالکل کا الف، ابوالحسن کا واؤ اور الف فی الحال کی ی اور الف۔

اس باب میں ایک بڑا گروہ اس حق میں ہے کہ یہ اور ایسے تمام ساکت حروف پر ایک چھوٹا سا سید حافظ (ــ) کھنچا ہونا چاہیئے، اس طرح شمس العلماء، بالکل، ابوالحسن، فی الحال، اور شمس الدین کا شمار املا مع علامات ہوا۔ اگر ان علامتوں کی پابندی کی جائے تو جہاں دو حروف (آل) ساکت ہوتے ہیں تو وہاں دوسرے ساکت حرف کے بعد کا

کا حرف مشدد ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر "شمس الدین" میں الف اور لام دونوں ساکت ہیں، لیکن اس کے ساتھ ہی شمس الدین کی دال (د) بھی مشدد ہو جاتی ہے۔

دراصل یہ مسئلہ حروف شمسی اور حروف قمری کا ہے عربی حروف تہجی میں سے شمسی اور قمری حروف ذہن نشین کر لینے سے یہ مسئلہ از خود حل ہو جاتا ہے۔ شمسی حروف میں (دال) کے ساتھ حروف علت لکھے جاتے ہیں اور بولے نہیں جاتے قمری میں لکھے بھی جاتے ہیں اور بولے بھی۔

سوم اس ضمن میں واو معدولہ ہے، یہ فارسی الاصل الفاظ میں ملتا ہے، مثال :- خود، خوش، خورشید وغیرہ یا خواب، خواہ، خوان وغیرہ۔

چہارم نون غنہ کا قضیہ ہے یہ عربی الفاظ میں نہیں ہے فارسی، سنسکرت اور ہندی میں کثرت سے ملتا ہے، جیسے :- جنگ، سنگھ، چاند وغیرہ۔ اس (نون غنہ) پر ایک چاند نما دائرہ (ں) دیا جاتا ہے، ایسے تمام الفاظ میں چاند نما دائرہ ہی کافی ہے، نقطہ کم ہونا چاہیے۔

اردو املا میں، ان چار مواقع (عربی دال، عربی الفاظ میں حروف علت، واو معدولہ (فارسی) اور نون غنہ) پر اگر اس گروہ کی رائے مان لی جائے جو ان پر علامات کی تائید میں ہے تو ان علامتوں کو لگانے میں ایک حد تک کچھ زیادہ وقت صرف ہوگا۔ عبارت میں گنجلک بھی پیدا ہوگی اور کاغذ بھی زیادہ خرچ ہوگا۔ اور آج کی تیز رفتار زندگی میں، اردو املا پر یہ بار گراں کوئی معقول عمل نہیں ہوگا۔

اس باب میں ایک دوسرے گروہ کی یہ بھی رائے ہے کہ ان مواقع کے تمام حروف ہی کو حذف کر دیا جائے۔ میں اب سے کچھ دیر پہلے کہہ چکا ہوں کہ ایسا کرنے سے ہمارا ایک بڑا لسانی سرمایہ فوت ہو جائے گا اور آنے والی نسلیں ہمارے اس تمام سرمائے سے بے بہرہ ہو جائیں گی۔ ان حروف کا اپنے الفاظ میں بجنسہٖ رہنا از بس ضروری ہے۔ یہ کس کو پسند ہوگا کہ اردو میں ایسے الفاظ کا املا کچھ اور ہو اور فارسی عربی میں کچھ اور؟

اب رہی اعراب و علامات کی بحث! اردو املا لکھتے وقت دس علامتیں الفاظ کے زیر و بم کو ظاہر کرتی ہیں، ان میں مد (~) دوسری تشدید (ّ)، تیسری ہمزہ (ء یا ؤ)، چوتھی جزم (ْ)، پانچویں زیر (ِ)، زبر (َ)، پیش (ُ) ۔ چھٹی تنوین دو زبر (ً) دو زیر (ٍ)، دو پیش (ٌ) ہیں۔ ان میں چار علامتیں نئی قائم ہوئی ہیں ان میں نمبر (۷) جو ساکن حرف سے شروع ہونے والے لفظ میں آتا ہے۔ مثلاً :- سکول۔ دوسری واو لین (وٗ) جو ثقیل واؤ کی آواز کی نشاندہی کرتی ہے۔ مثلاً ڈھول۔ تیسری یائے لین (ےٗ) جو یائے مجہول کے ثقیل تلفظ کی نشانی ہے۔ مثلاً جھیلا۔ چوتھی رائے ممدودہ (رٖ) جو (ر) کو ثقیل زیر کے ساتھ ادا کرتی ہے۔ مثلاً امرت۔

دراصل ان تمام علامتوں (نئی سمیت) میں سے صرف مد (~) تشدید (ّ) اور تنوین میں سے دو زبر کا تحریر میں درج کرنا کافی ہے۔ چونکہ ان کے بغیر یہ جاننا مشکل ہے کہ کون حرف دہرا وزن رکھتا ہے، کون حرف دوبارہ ادا کرنا ہے۔ اور کس لفظ کے آخر حرف کو نون کی صورت میں ثقیل زبر کے ساتھ سمجھنا ہے لیکن اردو میں تنوین کے دو زبر کا استعمال صحیح نہیں ہے۔ مثال کے طور پر حقیقت سے اس طرح حقیقتہً لکھنا چاہیے مگر ہم اس طرح حقیقتاً لکھتے ہیں جو صحیح نہیں ہے۔

ان علامات میں ہمزہ (ء یا ؤ) کا استعمال بھی قابل غور ہے! عربی الفاظ میں ع کی آدھی آواز ہے۔ (اس کو متحرک زبر بھی سمجھنا چاہیے اور نصف الف بھی) یہ ہندی الفاظ (جو اردو تحریر میں آتے ہیں) میں یائے مجہول کی نصف آواز بھی ظاہر کرتا ہے۔ مگر ہمارے یہاں اس کو عام طور سے یائے معروف کی جگہ استعمال کرتے ہیں: مثلاً :- خائش، نئے، مسائل وغیرہ ان الفاظ اور اس نوع کے دوسرے تمام الفاظ میں کہیں بھی یہ ہمزہ (ء یا ؤ) لکھا وٹ کے اعتبار سے صحیح نہیں ہے۔ ایسے الفاظ میں (ء) کے بجائے یائے معروف کے نقطے ہونے چاہئیں، اس طرح: خاہش، نیے، مسایل۔

البتّہ ان تمام علامتوں کا نئے الفاظ (جو عبارت میں بہت کم استعمال ہوتے ہیں یا جن کو خاص ضرورت کے لئے ہی جوڑ دی جاتی ہے) پر استعمال بے محل نہ ہوگا۔ بعض معمولی مواقع پر بھی کوئی حرج نہیں ہے، لیکن کوئی بھی پرانا لفظ (جو کثرت سے لکھنے اور بولنے میں آتا ہے) اس پر ہرگز کوئی علامت نہیں ہونا چاہیے۔ چونکہ ہم اس کی اصل کو پہلے سے جانتے ہیں۔

بعض حضرات تو مرکب الفاظ میں بھی علامات لگانے کے حق میں ہیں، مثلاً :- راہ گیر، مہاپاپ کے درمیان اس طرح راہؔگیر، مہاؔپاپ۔

یہ تو اور بھی زیادہ مضحکہ خیز عمل ہے! کون لکھنے پڑھنے والا یہ نہیں جانتا کہ مرکب الفاظ کون سے ہوتے ہیں اور مفرد لفظ کون سا ہے؟

بقیہ: فن ترجمہ

اپنی زبان پر عبور ہونے کے ساتھ دوسری زبان کی تفہیم اس درجے پر حاصل ہو کہ مترجم اس زبان کے حسن بیان اور نزاکت خیال کو محسوس کر سکے۔ مگر اسی کے ساتھ مترجم کی تخئیل کا نہایت قوی ہونا پہلی شرط ہے؛ اس کی قوت متخیلہ شاعر کی طرح از بس تیز اور نازک ہونا چاہیئے۔ اس کمال کے بغیر وہ مصنف کا جامہ پہننے میں کامیاب نہ ہو گا۔ اور مصنف کا جامہ پہننے سے مراد یہ ہے کہ مترجم مصنف کی روح کے اندر داخل ہو سکے۔ بالفاظ دیگر یوں سمجھنا چاہیے کہ مترجم کی تخئیل اگر نہایت قوی نہ ہوگی تو وہ مصنف کے خیال و احساس کو اپنا نہیں سکے گا۔ یہ زور تخئیل ہی تنہا وہ شے ہے جو مترجم کو مصنف کے خیال و احساس اور اس کے ہر ہر پہلو پر متصرف کرا دیتی ہے۔ یہ شرط اگر پوری نہیں ہوتی تو مترجم کی محنت رائگاں جانے کی پیشگوئی کی جا سکتی ہے۔ قوی تخئیل سے کام لے کر مترجم یہ سوچنے میں کامیاب ہو سکتا ہے کہ مصنف کا خیال و احساس اگر خود اس کا خیال و احساس ہوتا تو وہ اسے کس اسلوب سے بیان کرتا یا یہ کہ مصنف اگر مترجم کی زبان میں تصنیف کرتا تو اس کا پیرایہ اظہار کیا ہوتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس طرح سوچ سکنے والا مترجم فن ترجمہ کی دیگر ضروری شرائط کو پورا کرنے کے قابل ہو سکتا ہے۔

امریکن نقاد ہمفریز کا حوالہ اوپر کی سطروں میں گزرا ہے؛ اس کا مشورہ ہے کہ ناول و افسانہ نویس ہی افسانہ و ناول کا ترجمہ کرے، ڈرامے کا مترجم ڈراما نویس ہی ہو اور شاعر کو نظم کا ترجمہ کرنا چاہیئے۔ اس پر ہمفریز یہ اضافہ اور کرتا ہے کہ ایک صناع کو صناع ہی بہتر طریق پر سمجھ سکتا ہے اسے ایسے ادیب کو ترجمہ کرنا چاہیئے جو باستحقاق خود صناع ادب نہیں ہے۔

کتنی ذہنیت اعتراض کرے گی کہ جو خود تخلیقی ادب پیدا کر سکتا ہے اس کے لئے ترجمہ کرنا کیا ضرور؟ میں اس کے جواب میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ ایک اعلیٰ تصنیف کا ترجمہ کر کے مترجم خود بھی کچھ سیکھتا اور تخلیقی و کلچری اعتبار سے کچھ بہتر صناع بن جاتا ہے؛ یہ فراموش نہ ہونا چاہیے کہ اس دنیا میں کوئی شے کامل نہیں ہے۔ اصلاح و ترقی کی گنجائش ہر شے میں ہمیشہ رہتی ہے۔

ظاہر ہے کہ میری اس خامہ فرسائی کا مقصود اردو کے اعلیٰ علم و ادب کو ترجمے کی ضرورت اور اس کے احیاء پر متوجہ کرنا ہے۔

یہ صورت حال اطمینان بخش ہے کہ سرکاری ادارہ ساہتیہ اکاڈمی نے دنیا کی کلاسکی تصانیف کو ہندوستان کی چودہ آئینی زبانوں میں منتقل کرانا شروع کر دیا ہے، اور اس طرح اردو کو بھی خاطر خواہ نفع پہنچے گا۔ لیکن ہمیں یاد رکھنا ہے کہ زبانوں کی توسیع ترقی میں حکومت وقت کی امداد ہی کافی نہیں ہے۔ یہ کام تو اس زبان کے بولنے والوں کی باہم سعی و جہد سے انجام پاتا ہے۔

اردو زبان اپنی قابلیت و صلاحیت کے باوجود کم عمر و کم مایہ ہے اور اس کی صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے زیادہ ضروری ہے کہ اس میں وسیع پیمانے پر مستقل طور پر تصانیف کے ترجمے ہوتے رہنے کا انتظام کیا جائے۔ اور اردو کی توسیع و ترقی کے خیال کے ساتھ انجمن ترقی اردو (ہند) کا خیال لازمی طور پر آتا ہے؛ یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ چنانچہ جب انجمن کی کارگزاری پر نظر پڑتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا اپنا ایک آرگن جاری ہے، کتابیں بھی شائع ہوتی رہتی ہیں اور کانفرنسیں اور اجتماع بھی ہوتے رہتے ہیں، لیکن اس علم و احساس کے باوجود یہ تمنا رہتی ہے کہ انجمن کو اس سے زیادہ کام کرنا تھا۔ ظاہر ہے کہ انجمن اتنا ہی کام کر سکتی ہے جتنی اس کی مقدرت ہے؛ البتہ وہ اپنے وسیلوں کو بڑھا سکتی ہے؛ اس لئے سرکاری امداد پر قناعت کر لینا ترقی زبان کے راستے میں رکاوٹ کا مترادف ہے۔ انجمن کے لئے عوام میں جا کر ان کے قوائے عمل کو حرکت میں لانا ضروری ہے، عوام الناس کی امداد حاصل کر کے انجمن دوسرے ضروری کام اٹھا سکتی ہے جو وسائل کی کمی کے سبب معرض التوا میں پڑے ہیں۔

میری ناچیز رائے ہے کہ انجمن مستقلاً ترجمے کا شعبہ منظم کرے جس کا پہلا کام یہ ہو کہ ادبی نوبل پرائز پانے والوں کی اختراع فائقہ تصانیف کے ترجمے کرائے اور اس کے بعد اعلیٰ ادبی قدر کی Best Seller کتابوں کے ترجمے ہوں۔ اس کی صورت میرے ذہن میں یہ ہے۔ ایک سہ ماہی اشاعت میں ایک پوری کتاب شائع کی جائے۔ اور انجمن کے وسائل ایسے ہیں کہ کل ہند بنیاد پر ورلڈ بک کلب کے طریقے پر چار پانچ ہزار ممبر بنائے جا سکتے ہیں جنہیں یہ رسالہ ان کے سالانہ چندے کے عوض بھیجا جائے۔ اس کے علاوہ سرکاری طور پر لائبریریوں کی سرپرستی حاصل کی جا سکتی ہے۔ اس طرح میرے خیال میں سرمائے کا سوال حل ہو جانا چاہیئے۔ غور و بحث سے اس تجویز کو قابل عمل بنایا جا سکتا ہے۔

جاسوسی دنیا، رومانی دنیا اور فلمی رسالوں کی مقبولیت سے یہ تو ماننا پڑے گا کہ اردو زبان جاننے والوں میں کتب بینی کا مذاق پیدا ہو چکا ہے۔ اس بڑھتے ہوئے ذوق و شوق کو اگر صحیح راستے پر نہ ڈالا گیا اور ویسا ہی دلچسپ مگر پاکیزہ ادب کی بہم رسانی نہ کی گئی تو میرے خیال میں ایک نوع کا ظلم ہو گا۔ اور انجمن ترقی اردو کے ارباب حل و عقد کو ان کی ذمہ داری یاد دلانے کی ضرورت نہیں ہے۔

وما علینا الا البلاغ!

ہندوستان میں خلابازی کا پہلا اسٹیشن

پروفیسر ہمایوں کبیر مرکزی وزیر برائے سائنسی تحقیق و ثقافتی امور نے ۱۷ جون کو نینی تال میں ہندوستان کے پہلے فضائی رابطہ کے اسٹیشن یوپی اسٹیٹ آبزرویٹری کا افتتاح کیا۔ یہ فضائی آبزرویٹری (رصدگاہ) تمام دنیا میں قائم شدہ ۱۲ مصنوعی فضائی رابطہ کے مراکز میں سے ایک ہے۔ یہ ہندوستان کے واحد فضائی رابطہ کی آبزرویٹری ہے۔

یہ رصدگاہ ۱۹۵۱ء میں ڈاکٹر ایم کے وینو بپا کے زیر ہدایت قائم کی گئی تھی جو اس کے خاص ماہر فلکیات تھے اور اس کے پاس نہایت معمولی آلات تھے۔ پانچ سال بعد اس کو منورا پیک نینی تال منتقل کر دیا گیا تھا جہاں یہ بارہ ایکڑ کے رقبہ میں قائم تھی۔ ۱۲۰ انچ فی سال اوسطاً شدید بارش کے باوجود نینی تال کی راتیں عام طور پر صاف ہوتی ہیں اور اوسطاً سالانہ تقریباً دو ہزار گھنٹے رات کو سیاروں کا مشاہدہ کرنے کے لئے مل جاتے ہیں۔ رصدگاہ موجودہ ڈائرکٹر کی نگرانی میں سیاروں پر سائنسی تحقیقات کے سلسلے میں مفید کام کر رہی ہے۔ اب اس کے پاس مصنوعی سیاروں کے راستوں کا مشاہدہ کرنے اور چاند کی تصویر کشی کے لئے مخصوص کیمرے موجود ہیں۔

تعمیر کے کام میں مشینی دماغ کا استعمال

حساب داں مشینیں صرف لمبے لمبے جوڑ، باقی، ضرب اور تقسیم کے لئے استعمال نہیں ہوتیں۔ اب وہ نہایت پیچیدہ قسم کے سوالات حل کرتی ہیں۔ ریگا کے ریاضی دانوں نے مشینی دماغ کی مدد سے چالیس کارخانوں اور تحقیقی اداروں کے لئے حال ہی میں کوئی ڈیڑھ سو مشکل سوالات حل کئے ہیں۔ اگر یہ محض انسانی کاوش کے ذریعہ حل کئے جاتے تو ایک طویل مدت درکار ہوتی، اور غلطیوں کا احتمال رہتا۔

تعمیرات کے کام میں ہمیشہ ایک مشکل مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ آہن بستہ کنکریٹ اور دھات کی قوت برداشت معلوم کی جائے۔ اس کے لئے طویل حساب کتاب کی ضرورت ہوتی ہے، کیونکہ استعمال ہونے والی اشیاء کی قوت کی باہمی نسبت بھی درست کرنی پڑتی ہے۔ حساب داں مرکز کے ڈائرکٹر آرن کا خیال ہے کہ وہ مشینی دماغ کی مدد سے دو تین سو ڈزائن میں سے سب سے بہتر ڈزائن منتخب کر لیں گے اور اس سے لاکھوں روبل کی بچت ہوا کرے گی۔

وکٹر ہیوگو کے ناول کی صد سالہ سالگرہ

اب سے سو سال پہلے فرانس کے نامور مفکر اور ادیب وکٹر ہیوگو نے اپنی مشہور زمانہ ناول "لامزربل" لکھی۔ یہ کتاب ایک مجرم کی داستان زندگی ہے کہ وہ کس طرح آخرکار زمانے کی مشکلات کو سہتا اور سبق سیکھتا ہوا اپنی زندگی کو یکسر بدل دیتا ہے۔ ناول انسانی اخوت، بھلائی اور انصاف کے عالمگیر اصولوں پر مبنی ہے اور گذشتہ سو سال کی مدت میں دنیا بھر کے لاکھوں افراد کے لئے دلچسپی کا باعث رہا ہے۔ اس کی پہلی جلد مارچ ۱۸۶۲ء میں شائع ہوئی اور اس کے بعد دوسری، تیسری اور چوتھی جلدیں جون ۱۸۶۲ء تک شائع ہوئیں۔ اب آئندہ ماہ فرانس میں اس ناول کی اشاعت کی صد سالہ سالگرہ منانے کے انتظامات کئے جا رہے ہیں۔ اس پروگرام میں ملک کے ممتاز ادیب حصہ لے رہے ہیں۔ "لامزربل" کا متعدد زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے اور کئی بار اس کو فلمایا جا چکا ہے۔

پانچ ہزار ماہرین کینسر کا اجتماع

طبی سائنس کی سوویت اکادمی کے صدر نے جو بین الاقوامی کینسر یونین کے نائب صدر بھی ہیں اس یقین کا اظہار کیا کہ اس سال ماہرین کینسر کی ۱۰ویں عالمی کانگرس جو ماسکو میں منعقد ہونے والی ہے، پہلے سے زیادہ نمائندہ قسم کی کانگرس ہوگی۔ اس کانگرس سے بڑی دلچسپی کا اظہار ہو رہا ہے۔

خیال ہے کہ اس کانگرس میں دنیا کے مختلف ملکوں سے کوئی ۵ ہزار ماہرین آئیں گے اور کینسر کی تشخیص اور علاج پر تبادلۂ خیالات کریں گے۔

اقوام متحدہ کے نئے ٹکٹ

سب سے پہلے ۲۴ اکتوبر ۱۹۵۱ء کو یوم اقوام متحدہ کے موقع پر ادارہ نے ڈاک کا پہلا ٹکٹ شائع کیا۔ یہ ٹکٹ گذشتہ دس برسوں سے استعمال میں ہے۔ اب اقوام متحدہ کے ڈاک کی انتظامیہ نے فیصلہ کیا ہے کہ اس طویل مدت کے ٹکٹ کا ڈیزائن بدل دیا جائے۔ اس نئی قسم کا پہلا ٹکٹ اسی ماہ جاری ہوگا۔ اس نئے ٹکٹ پر پس منظر میں اقوام متحدہ کا زیتون والا مخصوص نشان ہوگا جس پر یہ الفاظ چھپے ہوں گے: "باہم دیگر امن و سلامتی سے رہنا" ایک دوسرے ٹکٹ پر جس کی قیمت ۳ سینٹ ہوگی، اقوام متحدہ کا نیلا جھنڈا چھپا ہے۔ اس کے علاوہ ۵ اور ۱۱ سینٹ کے ٹکٹ شائع کئے جائیں گے۔

مراسلات

اُردو لغت

اُردو نامہ شمارہ پنجم جولائی تا ستمبر سنہ ۱۹۶۱ء کے ضمیمہ میں ترقی اُردو بورڈ کراچی نے لغات اُردو کا جو نمونہ پیش کیا تھا اس کے مطالعہ سے احقر کو فی الجملہ مسرت حاصل ہوئی تھی اور اس کے بعض اغلاط کی تصحیح کی طرف ادارہ کے ذمہ دار حضرات کو محض نیک نیتی کی بنا پر متوجہ کیا گیا تھا۔ لیکن نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے۔ ۱۳ شمارہ تنقیدوں میں سے صرف تین تنقیدوں کا جواب ادارے کے بعض قابل یا مقبول حضرات نے شمارہ ششم اکتوبر تا دسمبر سنہ ۱۹۶۱ء میں دیا اور وہ بھی ایسا کہ

"ایں است جوابش کہ جوابش نہ دہی"

اب شمارہ ہفتم جنوری تا مارچ سنہ ۱۹۶۲ء اور شمارہ ہشتم اپریل تا جون سنہ ۱۹۶۲ء پیش نظر ہے، خدا کا شکر ہے کہ ان دونوں شماروں میں اغلاط نسبتاً کم ہیں، بہرحال بادی النظر میں جو اسقام یا اغلاط ظاہر ہوئے ان کی توجیہ و تصحیح درج ذیل ہے۔

ص19 - اب کے صفت، اب کا کی جمع۔

۱۔ سہ کس کو خبر تھی اب کے بچھڑے　　کیا جانئے اس سے کب ملیں گے
۲۔ سہ کچھ خریدا نہیں ہے اب کے سال　　کچھ بنایا نہیں ہے اب کی بار

تنقید۔ "اب" اسم ظرف ہے اور مضاف الیہ، "کے" علامت اضافت اور "بچھڑے" اور "سال" مضاف۔ اسے صفت کہنا نہ قدما کی تقلید ہے نہ متاخرین کی، بلکہ ایجاد بندہ اور وہ بھی گندہ۔ اور یہ نوٹ کہ ان دونوں صورتوں میں "کے" کے بعد اسم مذکر ہوگا تطویل لاطائل ہے، "کے" کے بعد تو اسم مذکر ہی ہوتا ہے، ہاں اسے صفت ہی کہنے پر اصرار ہے تو "وطن کی صبح اور فراق کی شام" میں ترکیب توصیفی ماننی پڑے گی (نہ کہ اضافی) حالانکہ اس کا کوئی قائل نہیں، بلکہ میں علی سبیل الترقی یہ کہتا ہوں کہ اس جدت سے تو ترکیب اضافی حرف غلط کی طرح مٹ جائے گی ہر جگہ صفت ہی صفت رہ جائے گی۔

ص۲۲ اُبانا۔ فعل متعدی
ص۲۳ اُبارنا۔ فعل ......
ص۲۳ اُبکنا　فعل
ص۲۴ اُبلنا　فعل

تنقید۔ یہ تمام مصادر ہیں اور ہر مصدر اسم ہوتا ہے (نہ کہ فعل، کیونکہ فعل میں زمانہ کا ہونا لازم ہے) انگریزی زبان کے نحوی بھی ایسی صورت کو infinitive کہتے ہیں اور تحلیل صرفی و نحوی میں اسے used as noun سے تعبیر کرتے ہیں۔

ص۲۳ ابابیل۔ ابابیل کی جمع۔ تنقید۔ ابابیل بھی لکھنا چاہئے اور جس طرح "اب دیدہ" کے تحت میں یہ نوٹ درج ہے کہ اردو اور فارسی میں حاء کی دال مخفف ہے۔ یہاں بھی بصیرت کے واسطے یہ لکھنا چاہئے کہ اگرچہ ابابیل جمع ہے لیکن اُردو میں بطور واحد مستعمل ہے۔

ص۲۳ اباطیل۔ جمع مذکر، تنقید۔ واحد بھی بیان کرنا چاہئے یعنی ابطولہ ابطالہ (جیسی جمع ابابیل کا واحد ص۲۳ پر درج کیا ہے)۔

ص۲۸ ابجت اسم مذکر۔ تنقید۔ ابجت وہی ہے جو ابجد کی طرح (ص۲۸ ملاحظہ ہو)

ص۲۱ (ابتر کی سند میں) سہ تری تقریر میں دور و تسلسل لازم آتا ہے، جو ہے بالاتفاق اہل خرد میں باطل و ابتر۔ تنقید۔ یہاں دور و تسلسل چاہئے (واو عاطفہ کے ساتھ) دور کو انگریزی میں argument in a circle اور تسلسل کو Regressus ad Infinitum اور سنسکرت میں ان کو چکرک اور انوستھا کہتے ہیں۔ تسلسل میں دور نہیں ہوتا اس لئے اضافت غلط ہے، یہ دونوں باطل ہیں اور کلام و معقول کی کتابوں میں اکثر ساتھ ساتھ آتے ہیں۔ ممکن ہے کہ کاتب نے واو ساقط کر دیا ہو یا طباعت کی غلطی ہو۔

ص۳۳ ابدال۔ جمع۔ واحد بدل۔ تنقید۔ واحد بیان کیا اچھا کیا اور یہ لکھتے تو اور اچھا ہوتا کہ ابدال اُردو میں بطور واحد مستعمل ہے۔

(محمد مصطفیٰ علی گڑھ)

چہ دلاور است دزدے ......!

مئی سنہ ۶۲ء کے "ہماری زبان" میں احمد وصی صاحب بی۔اے کا مراسلہ "یہ ہے نصاب جامعہ اُردو"۔ اور اس کے نیچے ہی جناب ضمیر الدین قریشی کا "جواب مولف" بھی نظر سے گذرا۔ جامعہ اُردو کی داخل نصاب "اُردو صحافت اور دوسرے مضامین" اس سے قبل دیکھ چکا ہوں جس میں سب سے پہلے نمبر پر میرے ہی ایک مطبوعہ مضمون "ہندوستانی صحافت کی پہلی تاریخ" کا قتل عام کیا گیا ہے اور وہ بھی اس دلیرانہ آن بان کے ساتھ۔ گویا یہ مضمون جناب ضمیر الدین قریشی ہی کی دماغی کاوشوں کا نچوڑ ہے۔ اس کتاب میں ملک کے بہت سے نامور ادیبوں کے مضامین پر مجرمانہ ڈاکہ زنی کرکے انھیں اس طرح اپنایا گیا ہے جیسے یہ سارا کارنامہ قریشی صاحب ہی کی ژرف نگاہی کا نتیجہ ہے۔ نہ تو کسی مضمون کا صحیح حوالہ دیا گیا ہے نہ صاحب مضمون کا نام۔ میرا یہ مضمون (ہندوستانی صحافت کی پہلی تاریخ) سب سے پہلے ماہنامہ آج کل دہلی (جولائی سنہ ۱۹۵۵ء) میں شائع ہوا تھا پھر پریس انفارمیشن بیورو کے اُردو بلیٹن میں باقاعدہ چھپا تھا اور میرے ہی نام سے!

قریشی صاحب کا یہ "عذر گناہ" افسوسناک ہے کہ جو مضامین جس طرح آئے شائع کر دئے گئے!

میرے ہی ساتھ نہیں، بعینہ یہی سلوک دوسرے بلند پایہ محققین کے ساتھ کیا گیا ہے جس کی ذمہ داری جناب قریشی صاحب ہی پر عائد نہیں ہوتی بلکہ "جامعہ اُردو" پر بھی عائد ہوتی ہے۔

(ناظم سیتاپوری)

پتہ دیکھئے

اگر آپ کے پتہ پر سرخ نشان ہے تو سمجھئے کہ
آپ کی خریداری کی مدت ختم ہو گئی ہے۔
مہربانی فرما کر ہماری زبان
کا سالانہ قیمت مبلغ چھ روپے منی آرڈر سے
بھیج کر سلسلہ جاری رکھئے۔
منیجر

انجمن ترقی اُردو راجستھان کی سہ سالہ رپورٹ

—— گذشتہ سے پیوستہ ——

ریڈیو اسٹیشن جے پور | ریڈیو اسٹیشن جے پور پر اُردو کے ساتھ کوئی قابل تعریف سلوک تو نہیں کیا جا رہا ہے تاہم پہلا سا عمل بھی نہیں ہے۔ البتہ یہ عجیب بات ہے کہ جودھ پور میں مشاعرہ ہو اور وہاں کا ایک شاعر بھی شریک نہ کیا جائے۔ اسی طرح جے پور کے مشاعروں میں۔ اُردو دوست سخن فہموں کو بحیثیت سامع بھی ادارہ مذکور مدعو نہ کرے۔ مثلاً انجمن ہذا کے ارکان میں سے چند ہی صاحبان کو ایسے مواقع پر دعوت نامے بھیجے جاتے ہیں، حالانکہ دفتر ہذا سے دو بار مکمل فہرست بھیجی جا چکی ہے اور زبانی بھی کہا گیا ہے۔

یونانی دواخانے | کی بابت انجمن ہذا کے بار بار لکھنے پر یہ جواب آ چکا ہے کہ نسخہ جات ہندی میں لکھنے کی کوئی پابندی نہیں ہے۔ چونکہ اس معاملے کو طبیہ کالج کی مجلس منتظمہ سنبھالے ہوئے ہے اس لئے انجمن ہذا مزید خط و کتابت کی ضرورت نہیں سمجھتی۔

اُردو فلمیں | آج سے تقریباً دو سال پہلے تک جو فلمیں اُردو زبان میں بنائی جاتی تھیں ان کو بھی ہندی زبان ہی کا سرٹیفکٹ دیا جاتا تھا۔ چنانچہ یہ صدائے احتجاج اول جے پور ہی سے اُٹھی۔ اخبارات میں کافی مضامین شائع ہوئے۔ انجمن ہذا نے "بورڈ آف سینسر" کو بھی بار بار لکھا۔ حکومت ہند کو بھی توجہ دلائی۔ ڈائریکٹروں اور فلم سازوں کو بھی متوجہ کیا۔ پروڈیوسروں کو بھی توجہ دلائی۔ بمبئی کی شاخ انجمن کو بھی تحریر کیا۔ مرکزی انجمن سے بھی استدعا کی۔ آل انڈیا اُردو کانفرنس کا پور میں بھی یہ ریزولیوشن پیش کر کے منظور کرایا۔ تب کہیں جا کر سب سے پہلے فلم "برسات کی رات" کو اُردو کا سرٹیفکٹ مل سکا اور اس کے بعد تقریباً سات آٹھ فلموں کو اُردو کا سرٹیفکٹ مل گیا ہے۔ نیز حکومت ہند سے مسلسل خط و کتابت کرنے پر جواب آیا ہے کہ ڈاکومنٹری اور دوسری فلمیں بھی اُردو میں تیار کی جائیں گی۔ لہٰذا اب اس حکم پر عمل کا انتظار ہے۔

ساہتیہ اکیڈمی راجستھان اودے پور | یہ ادارہ کئی برس سے ہندی، سنسکرت، اردو اور راجستھانی ادب کی حفاظت و ترقی کے لئے قائم ہے۔ اودے پور اس کا صدر مقام ہے، اور جہاں تک ہماری معلومات ہے اس کو [illegible] لاکھ روپیہ سالانہ گورنمنٹ راجستھان کے خزانہ سے ملتا ہے۔ یہ رقم ظاہر ہے کہ ٹیکسوں سے جمع ہوتی ہے جو اُردو والے بھی ادا کرتے ہیں۔ مگر آج تک باوجود یاد دہانی و توجہ دلانے کے اس نے اُردو کی بابت کچھ نہیں کیا۔ اور صاف جواب دے دیا کہ اُردو رسم خط میں کوئی چیز شائع کرنے کو یہ ادارہ تیار نہیں۔

حتیٰ کہ اُردو میں خط و کتابت سے بھی اسے انکار ہے۔ دراصل اس کے اعلیٰ عہدہ دار ڈائریکٹر اور پریذیڈنٹ اُردو سے ناواقف ہیں۔ حالانکہ ایک علمی و ادبی ادارہ ہونے کے باعث اس کا انتظام ایسے لوگوں کے ہاتھ میں ہونا چاہئے جو سب زبانوں سے بقدر ضرورت واقف ہوں۔ اس کے علاوہ اُردو کی صحیح نمائندگی کا بھی کوئی موقع اس میں نہیں دیا گیا۔ اس طرح اُردو کا جائز حق اس جمہوری دور میں غصب کیا جا رہا ہے۔ لہٰذا اُردو دوستوں کو کسی موثر و مناسب اقدام کی ضرورت ہے۔

اُردو اداروں کو مالی امداد | جہاں تک انجمن ہذا کی معلومات کا تعلق ہے۔ اُردو کے کسی ادارے کو کوئی مالی امداد راجستھان میں نہیں ملتی نہ کسی قسم کی کوئی اور رعایت حاصل ہے۔

اُردو ریڈنگ روم | انجمن ہذا کے کافی خط و کتابت کرنے اور ایک وفد کے ملنے پر مبلغ دس ہزار روپیہ کی منظوری بعد کوشش بسیار مہاراجہ سے سکریٹری دلوانے ہیں تب سے اُردو ریڈنگ روم تعمیر کرانے کے لئے ملی تھی۔ مگر کوئی موزوں جگہ نہیں مل سکی کہ اس سے فائدہ اٹھایا جاتا۔ اب بھی اگر آپ صاحبان کوئی موزوں جگہ تجویز کر سکیں جو اُردو ریڈنگ روم بنایا جا سکتا ہے۔

اُردو کے اساتذہ کی ٹریننگ | [illegible] کافی خط و کتابت [illegible] ابھی تک کوئی انتظام نہیں ہوا۔

آل انڈیا اُردو کانفرنس کانپور | [illegible] آل انڈیا اُردو کانفرنس [illegible] کانپور میں شرکت کے لئے انجمن ہذا کی جانب سے پروفیسر [illegible] صاحب تشریف لے گئے تھے۔ اور راجستھان کی مقامی شاخوں سے بھی کچھ نمائندے شریک ہوئے تھے۔

حسابات | [illegible] کا مجموعی اظہار [illegible] کیا جا چکا ہے [illegible] پیش کر رہے ہیں۔ حسابات کی بابت [illegible] راقم الحروف [illegible] بعد مع [illegible] صاحب کی خدمت میں پیش کر دئے جاتے ہیں۔ اور [illegible] کو قائم لکھتے ہیں۔ اگر کوئی غلطی ہوتی ہے تو [illegible] کر دیتے ہیں۔ [illegible] صاحب کی خدمت میں پیش کر [illegible] اور اصل [illegible] سے خازن صاحب [illegible] رہتے ہیں۔ اس طرح خازن صاحب کے [illegible] صاحب کی توثیق کے بعد حسابات کو صحیح سمجھا جاتا ہے۔

اجلاسات | [illegible] مختصراً شروع میں [illegible]

عرض کیا جاچکا ہے۔ البتہ کوئی بڑا اجتماع مارچ ۱۹۵۹ء کے بعد سے اب تک نہیں ہوا۔ جس کی ضرورت بھی ہے اور مطالبہ بھی مگر یہ بھی واضح حقیقت ہے کہ کوئی معقول و کامیاب، نمایاں اور مفید کانفرنس یا جو بھی کچھ اس کا نام رکھا جائے۔ اردو دوستوں ہی کی ہر قسم کی امداد پر منحصر ہے۔ کارکنان انجمن تو حاضر ہی ہیں۔ دیگر اردو دوست اصحاب اس کی بابت فیصلہ فرمائیں۔

اظہارِ تشکر

صحیح اظہار تشکر کرنا جس قدر مذموم امر ہے ظاہر ہے۔ لہٰذا میرا فرض ہے کہ میں انجمن ہٰذا کے صدر محترم کا تہ دل سے شکریہ ادا کروں جن کی اعلیٰ مدبرانہ بصیرت۔ دلی ہمدردی اور عملی رہنمائی و ہدایت کے باعث مذکور الصدر خدمات انجام دی جاسکیں اور انجمن ہٰذا کا قیام و نظام مستحکم تر ہوتا جارہا ہے۔ اسی طرح راؤ بہادر پنڈت اونکار نرائن صاحب اور خان محمد برکت اللہ خاں صاحب منسٹر آف گورنمنٹ راجستھان۔ انجمن ہٰذا کے نائبین کا جن کی توجہ فرمائی اور ہر گونہ جائز و امکانی اعانت سے ہمارے کام میں پیش رفت ہوئی ہے اور ابھی کافی توقعات ہیں۔ علیٰ ہٰذا اپنے دیرینہ مصلح و رہنما پنڈت کاشی پرشاد صاحب توتڑی کا ممنون احسان ہوں کہ جو اپنے معروف ترین وقت کا کافی حصہ انجمن کو عنایت فرماکر اس کے حسابی معاملات کو بنظر غائر پورے کفایت شعارانہ طریق پر جانچتے رہتے ہیں۔ نیز ارکان انجمن کا جن کی دلی ہمدردیوں۔ دلچسپیوں۔ اور امدادوں سے اس کا کام چل رہا ہے۔ اور آپ جملہ حضرات حاضرین کا بھی جنہوں نے قدم رنجہ فرماکر انجمن کی عزت و حوصلہ افزائی فرمائی۔

مجھے میرے علمی و عملی معاونین جوائنٹ سکریٹری صاحب اور اسسٹنٹ سکریٹری صاحبان کی اعانت و امداد کی بابت وہ الفاظ نہیں ملتے جو ان کی خدمات انجمن کی صحیح ترجمانی کرسکیں۔ یوں سمجھ لیجئے کہ ان کا خلوص عمل مجھ میں تازہ شوق اور نیا جذبہ کار پیدا کرتا رہا ہے۔

یہی امور ہیں جنہوں نے مجھ جیسے دائم المریض و نحیف سے اتنا کام لے لیا جو حسب خیال عقلاً اچھا یا برا کہا جاسکتا ہے کیونکہ:-

بقدر پیمانۂ مسرت سبو ہر دل میں ہے خوشی کا
اگر جو یہ فریب پیہم تو دم نکل جائے آدمی کا

انجمن ہٰذا خوش قسمت ہے کہ اس کو مذکور الصدر جیسے عہدیدار و ارکان میسر ہیں اور

(۱) جناب ساہو گوردھن داس جی صاحب کا برا جود ھپوری
(۲) معتاز الدولہ جناب نواب محمد کرم علی خاں صاحب مکرم
(۳) جناب الحاج محمد جی صاحب ٹھیکیدار عمارات
(۴) جناب نواب محمد عبد الباقی خاں صاحب
(۵) جناب الحاج حیدر بخش صاحب کنٹریکٹر
(۶) جناب استاد عبد الرزاق عرف اچھا میاں صاحب جوہری جیسے سرپرست۔ نیز
(۱) جناب ڈاکٹر اوم پرکاش صاحب وید۔ اجمیری
(۲) جناب احسان الٰہی صاحب شمسی سوداگر جے پوری
(۳) جناب حاجی الدین نور محمد صاحب جے پوری۔ معاونین حاصل ہیں۔

اس اظہار امتنان و تشکر کے ساتھ میں آپ سے رخصت ہورہا ہوں اور عالی جناب الحاج خان بہادر الطاف احمد صاحب خیری صدر انجمن سے درخواست کرتا ہوں کہ اپنے بصیرت افروز خطبے سے ہمیں مستفید فرمائیں۔

احترام الدین احمد شاغل
جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو۔ راجستھان

انجمن کی مطبوعات

اردو ہندی ڈکشنری	مرتبہ انجمن	قیمت ۲۰٫۰۰
باپو کے قدموں میں	ڈاکٹر راجیندر پرشاد	۱۵٫۰۰
سیاسیات کے اصول (مکمل)	ہارون خاں شروانی	۵٫۰۰
کاروان معیشت	نجم الدین شکیب	۲٫۵۰
دھیپد	منور لکھنوی (مترجم)	۳٫۰۰
مرقع افغان	ابرار حسین فاروقی	۳٫۲۵
ہندی ادب کی تاریخ	ڈاکٹر محمد حسن	۵٫۵۰
قومی تہذیب کا مسئلہ	ڈاکٹر سید عابد حسین	۶٫۰۰
ہندوستانی سماجیات	ڈاکٹر جعفر حسن	۴٫۵۰
ادبی قومی تذکرے (اول)	کشن پرشاد کول	۶٫۵۰
〃 (دوم)	〃	۴٫۵۰
اسلامی فن تعمیر	مبارز الدین رفعت	۶٫۰۰
کچھ زر کی بابت (مجلد)	ابو سالم	۴٫۵۰
نفسیات افواہ	ولی الرحمٰن	۱٫۷۵
اخلاقی سماجیات	ڈاکٹر جعفر حسن	۴٫۵۰
انواع فلسفہ (مجلد)	ظفر حسین خاں	۵٫۵۰
ایک مشرقی کتب خانہ	مبارز الدین رفعت	۳٫۰۰
مذہب اور دھرم	مہاتما گاندھی	۴٫۰۰
مشترکہ زبان	〃	۴٫۵۰
حیات اجمل	قاضی عبد الغفار	۸٫۰۰
محاسن کلام غالب	ڈاکٹر عبد الرحمٰن بجنوری	۱۰٫۰۰
زنداں نامہ (مجموعہ کلام)	فیض احمد فیض	۱٫۲۵

انجمن ترقی اردو ہند۔ علی گڑھ

پبلشر نذیر حسن پرنٹر ضمیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھپوا کر مرکزی انجمن سے شایع کیا